



# مقام تسلیم و رضا

## مفتی منیب الرحمن

تسلیم و رضا کے معنی ہیں: ”اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا، اپنی نفسانی خواہشات و ترجیحات کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینا، اپنی انا کو اس کی رضا میں فنا کر دینا، اسی کو فنا فی اللہ بھی کہتے ہیں اور انگریزی میں اسے Total Submission سے تعبیر کیا جاتا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اسی معنویت کو ان آیات مبارکہ میں بیان فرمایا ہے: (1) ”اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے بہت باخبر ہے، (مومن: 44)۔“ (2) ”اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، (بقرہ: 207)۔“ (3) ”بے شک اللہ نے اہل ایمان سے اُن کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، پھر (اللہ کے دشمنوں کو) قتل کر دیتے ہیں یا (راہ حق میں) شہید ہو جاتے ہیں، اس پر اللہ کا تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے، سو تم اپنے اس سودے کی خوشی منانا جو تم نے اللہ سے کی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، (توبہ: 111)۔“ (4) ”مومنوں میں سے کچھ مردان (وفا شعار) ایسے ہیں کہ جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ وفا کر دیا، سو اُن میں سے بعض نے (شہید ہو کر) اپنی نذر پوری کر دی اور بعض (اپنی باری کے) انتظار میں ہیں اور انہوں نے (اپنے وعدے میں) کوئی تبدیلی نہیں کی، (احزاب: 23)۔“

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے تسلیم و رضا کی یہ لازوال مثال قائم کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”سو جب (باپ بیٹا) دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل گرا دیا، (الصُّفَّت: 103)۔“ مراحل ابتلا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزیمت و استقامت کی شہادت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کلمات طیبات میں دی ہے: ”اور جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا، تو وہ (اس امتحان میں) پورا اترے، اللہ نے فرمایا: میں تمہیں انسانیت کا امام بنانے والا ہوں، (بقرہ: 124)۔“ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ”بے شک ابراہیم علیہ السلام (اپنی ذات میں) اللہ کی اطاعت گزار ایک



اُمت تھے، ہر باطل سے اجتناب کرنے والے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، (اللہ نے) ان کو منتخب کر لیا اور ان کو سیدھے راستے کی ہدایت دی اور ہم نے ان کو دنیا میں بھلائی عطا کی آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں سے ہوں گے، (النحل 120-122)۔“

پس تسلیم و رضا کا یہ شعار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے توسط سے رحمۃ اللعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک پہنچا۔ غزوہ حنین میں قبیلہ ہوازن کے شدید تیر اندازی کے سبب جب وقتی طور پر مجاہدین کے قدم اکھڑ گئے تو رسول اللہ ﷺ تنہا میدان میں پوری استقامت کے ساتھ کھڑے رہے اور فرمایا: ”میں نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔“ رسول اللہ ﷺ سے اللہ کی راہ میں عزیمت و استقامت اور جاں نثاری کی یہ وراثت آپ کے اہل بیت اطہار کو منتقل ہوئی اور میدانِ کربلا میں امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ، آپ کے اہل بیت اطہار و اعوان و انصار رضی اللہ عنہم کے ذریعے یہ اپنی معراج کو پہنچی، علامہ اقبال نے کہا تھا:

غریب و سادہ رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقرب بندے سراپا تسلیم و رضا ہوتے ہیں، وہ اللہ کی قضا و قدر پر شاکہ نہیں ہوتے بلکہ راضی رہتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جامع مسجد کوفہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ عبدالرحمن بن ملجم خارجی نے زیر لب کہا: ”میں ایسی چکی چلاؤں گا کہ لوگوں کو ان سے نجات دلا دوں گا۔“ کچھ لوگوں نے اس کی اس بات کو سنا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”آپ کے بارے میں اس کے ارادے خطرناک ہیں اور یہ آپ کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔“ اس پر حضرت علی نے کہا: ”ابھی تو اس نے مجھے قتل نہیں کیا۔“ اور ایک روایت کے مطابق آپ نے کہا: ”میں اپنے قاتل کو کیسے قتل کر دوں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا تھا: ”گزشتہ امتوں میں بد بخت ترین شخص وہ تھا جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس اُمت کا بد بخت ترین شخص وہ ہوگا جو تمہاری پیشانی کو خون سے رنگین کرے گا۔“ ایک بار بیماری کے عالم میں آپ سے کہا گیا: بہتر ہوتا کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لے جاتے: تو آپ نے فرمایا: اس بیماری میں میرا انتقال نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے عہد فرمایا تھا کہ موت سے پہلے مجھے امیر مقرر کیا جائے گا، پھر (جب میری شہادت کا وقت آئے گا تو) قاتل میری پیشانی سے داڑھی تک میرے خون سے رنگین کرے گا۔

یہ تمام حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا اور شاید قاتل کا بھی علم تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے قاتل کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ وہ شہادت کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ یہی صورت حال امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ کی بھی تھی کہ جب شہادت کی منزل انہیں آفتاب نصف النہار کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھی تو آپ کے پائے ثبات میں کو





کی لغزش نہ آئی اور اس منزل کو پانے کے لیے آپ تیار رہے۔ شب عاشور کو آپ نے چراغ گل کیا اور اپنے جاں نثاروں سے کہا کہ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں، تم سے انہیں غرض نہیں ہے۔ سو اگر تم میں سے کوئی جان بچا کر جانا چاہے تو میری طرف سے اُسے اجازت ہے، لیکن وہ سب کوہ استقامت تھے اور موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا، یہی منزل تسلیم و رضا ہوتی ہے کہ جب انسان دنیوی نفع و نقصان سے ماورا ہو کر حیات ابدی اور رضائے الہی کو اپنی منزل بنا لیتا ہے اور اس کے نتیجے میں اُس کے لیے جان سے گزرنے کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے، علامہ اقبال نے خوب کہا:

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی  
تو اسے پیانہ امروز و فردا سے نہ ناپ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی  
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اسی شعار کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کرب و بلا میں اُن بلند یوں تک پہنچایا کہ جس کی نظیر تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی۔ اللہ کی راہ میں ایثار و قربانی کا کوئی ایسا عنوان باقی نہ رہا جسے آپ نے اپنی نسبت سے مُشرّف نہ کیا ہو۔ اس سے پہلے جب آپ مدینہ منورہ سے عزم سفر کرنے لگے تو حلیل القدر صحابہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابوسعید خدری وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کو اس سفر سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اہل کوفہ کی بیوفائیوں کا بھی حوالہ دیا، لیکن آپ اپنے

عزم پر قائم رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کوفے کے لوگوں نے بڑی تعداد میں خطوط بھیجے اور آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی اور بطور امیر المومنین و خلیفہ آپ کی بیعت کرنے کا وعدہ کیا۔ آپ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے نسبتِ قرابت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرزند اور حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا لختِ جگر ہونے، اپنے علم اور ورع و تقویٰ کے سبب آپ خلافت کے زیادہ اہل ہیں۔ چنانچہ آپ عمرہ ادا کرنے کے بعد سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے کربلا پہنچے اور محرم الحرام 61ھ کے یوم عاشور کو جب کوفے کی مساجد سے جمعۃ المبارک کی اذان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، شقی القلب لوگ تقریباً اُسی وقت نواسر رسول کی گردن پر خنجر چلا رہے تھے۔ یہ منظر کسی بھی مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے لیکن امت کی بد نصیبی کہ بظاہر یہ ناممکن فعل واقع ہوا اور آج تک اس پر تمام اہل ایمان اور محبانِ رسول ﷺ و محبانِ اہل بیت رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین غمگسار ہیں۔

لیکن ستم یہ ہے کہ محبتِ حسین کے دعوے دار تو بہت ہیں اور اپنے اپنے انداز میں ان کی یاد بھی مناتے ہیں، ان کا غم بھی تازہ کرتے ہیں اور مجالس بھی منعقد کرتے ہیں، مگر اُن کی اقدار کو زندہ کرنے والے آج بھی کم ہیں، الغرض ذاکرینِ حسین تو بلاشبہ بے شمار ہیں، لیکن محافظین و متبعین اقدار حسین نایاب ہیں، اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

گر چہ تابدار ہے، اب بھی گیسوئے دجلہ و فرات  
قافلہ حجاز میں، ایک حسین بھی نہیں